ڈاکٹر تبسم کاشمیری

منٹو اور موجودہ انسانی رویے

Saadat Hassan Minto has a prominent status in Urdu Short stories. He knows well the sensity of human psychology. Study of human psychology was his farourite subject. In this article efforts are made to highilight the human behaviours.

منٹو کا دور ہندوستان کا کلونیل دور تھا۔ تخلیق کار کو لکھنے کی آزادی حاصل تھی۔ وہ جو چاہے لکھ سکتا تھا۔ منٹو نے جو چاہا لکھا، جیسا چاہا لکھا۔ اگرچہ اس کے افسانوں پر مقدمات بھی بنے۔ یہ مقدمے کلونیل پاور نے نہیں خود منٹو کے ہم وطنوں نے قائم کیے تھے مگر عدالتی نظام میں اسے مجرم قرار دنہ دیا گیا۔ مقدمات میں وہ سرخرو ہوا تھا۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ تخلیقی ادب لکھنے کی آزادی کے بغیر پنپ نہیں سکتا۔ ادبی، سیاسی، تہذیبی، معاشرتی اور اقتصادی آزادی لکھنے والے کو حاصل ہونی چاہیے۔ اگر یہ آزادی میسر نہ ہوگی تو تخلیقی سطح پر معاشرہ بنجر بھی ہوسکتا ہے اور غیر تخلیقی بھی۔ اور غیر تخلیقی معاشرہ کسی قوم کی آہستہ آہستہ ذہنی موت کا علان ہے۔ منٹو کے دور میں معاشرہ تخلیق کے عمل سے گزر رہا تھا۔ پورا منظر ایک بڑے تخلیقی منظر کو پیش کر رہا تھا۔ جس میں راشد، میرا جی، فیض، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، راجندر سنگھ بیدی اور دوسرے ادیب و شاعر اپنی اپنی تخلیقی قوتوں کا اظہار کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اردو افسانہ، ناول، شاعری اور نظم میں نئے نئے تجربات کی ایک نئی دنیا وجود میں آئی مگر منٹو کے بعد آج کے اس دور میں ادبی دنیا تبدیل ہوچکی ہے۔ منٹو کے دور میں انسان، انسان تھا۔ شاعر، شاعر تھا اور ادیب، ادیب۔ اور صحافی، صحافی۔ مگر آج ایسا نہیں ہے ہمارے اس دور میں انسانی رویے تیزی سے بدلے ہیں۔

آج ذرا اِدھر اُدھر نظر دوڑائیے سیاسی منظر نامہ بدل چکا ہے۔ ہمارے ہاں دہشت گردی راج کر رہی ہے۔ معاشرہ دہشت گردی کا شکار ہے۔ ایرک فرام نے ایک بہت دل چسپ بات لکھی تھی جو مجھے یاد آ رہی ہے اس نے کہا تھا کہ فرد میں تباہ کرنے کا ارادہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کے ہاں تخلیق کرنے کی خواہش پوری نہیں ہو پاتی اور اس اسے میں ناکامی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تخریب کار تخلیق سے محروم ہوتے ہیں اور وہ اپنی طرح معاشرہ کو بنجر بنانے میں پرتل جاتے ہیں۔ منٹو کو کسی دہشت گرد کا خوف نہیں تھا۔ معاشرہ جب دہشت گردی کی زد میں ہو تو لکھنے والا خوف محسوس کرنے لگتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ منٹو کے افسانوں پر فحش نگاری کے مقدمات بنائے گئے تھے۔ اگر آج منٹو زندہ ہوتا تو اس کا کیا بنتا؟ اس کے گھر کا کیا حال کیا ہوتا؟ اور اس کے افسانوی ادب کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا؟ آج کے رویے، تھکے ہارے تخلیقی رویے اپنی ساری دلیری کے باوجود خوف کی حالت میں ہیں۔ لیکن حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ ہمارا قومی ضمیر بڑی جرأت سے دہشت گردی کے خلاف اپنی Commitment کا اعلان کر رہا ہے اور یہ اعلان نامہ تخلیقی اظہار کی ایک صورت ہے اور سوسائٹی کو زندہ رکھنے کی بڑی علامت ہے۔

ہمارے اس جدید دور میں انسان Commodity بن چکا ہے۔ اوپن مارکیٹ موجود ہے۔ اس مارکیٹ میں اداکار ہے، اینکر پرسن ہے، استاد ہے، مزدور ہے، ڈاکٹر ہے، ایک بلند مقام پر وہ لوگ موجود ہیں جو مارکیٹ کے پلیئر (Players) ہیں۔ سب چیزیں بک رہی ہیں۔ ضرورت کا اتار چڑھاؤ قیمت کا تعین کر دیتا ہے۔ مارکیٹ اکانومی کنٹرول کر رہی ہے۔ ڈرامہ نگار کی تخلیق ایک طرف ہے اور دوسری طرف وہ ذہن ہے جو کمپنی کی مارکیٹ کو اونچا اٹھانے کے لیے حسب ضرورت سکرپٹ لکھنے والے کو ہدایات دے رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ پبلک کیا چاہتی ہے۔ سب کچھ Commodity بن گیا ہے۔ پروڈکشن ہو رہی ہے۔ پروڈکشن Commodity ہے۔

میڈیا Commodity Production کی مثال بن گیا ہے۔ زندگی کے ہر میدان میں اشیا بن رہی ہیں بک رہی ہیں۔ صارفین کی سوسائٹی اس کو صرف کر رہی ہے۔ ذرا سوچیے کہ صارفین کی اس سوسائٹی میں تخلیقی عمل کہاں ہو رہا ہے؟ تخلیق زوال کی طرف بڑھ رہی ہے۔ سوسائٹی غیر تخلیقی ہو رہی ہے۔ یہ ہم نے سوچنا ہے کہ تخلیق کے بغیر کیا کوئی سوسائٹی زندگی کا اظہار کر سکتی ہے؟ اس دور کے انسانی رویے ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔

ٹھنڈا گوشت کا ایشر سنگھ ایک مردہ لڑکی سے مجامعت کرتا ہے اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ جب اسے پتہ چلتا ہے تو جسمانی اور ذہنی طور پر شل ہو جاتا ہے۔ ایشر سنگھ جیسا کڑیل جوان ان اثرات کے باعث شدید طور پر اعصاب زدہ ہو جاتا ہے۔

منٹو کے اسی کردار کے اندر جو کئی قتل بھی کر چکا تھا اس سانحہ کے بعد انسان بیدار ہو جاتا ہے اس شعور سے اس کی ذہنی حالت منقلب ہوتی ہے اور اس صدمے کے باعث وہ اپنے مردمی جوہر سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

منٹو کا کمال یہی تھا کہ وہ بُرے سے بُرے کردار کے اندر انسان کو باہر نکال لاتا تھا۔ آدمی کی تمام تر برائیوں، اس کے شر، اس کی تباہ کاریوں اور گناہوں کے باوجود وہ انسان پہ یقین رکھتا تھا اور اسے کسی نہ کسی طرح دریافت کر لیا کرتا تھا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر آج منٹو زندہ ہوتا تو اس عہد کے خوف ناک حد تک بدلے ہوئے رویوں کو دیکھ کر اس کا ردعمل کیا ہوتا۔ فرض کیجیے اسے کوئی تھیم (Theme) اُکساتی اور وہ کہانی لکھنا چاہتا تو کیا وہ لکھ سکتا؟ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اس عہد کے سماج میں شاید وہ بابو گوپی ناتھ، ممی یا موذیل جیسے کسی کردار کو ہرگز تلاش نہ کر سکتا تھا۔ آج کے انسان کے مقابلے میں منٹو کے بابو گوپی ناتھ، ممی یا موذیل بہت ارفع کردار تھے۔ وہ اپنی انسانی کمزوریوں کے باوجود اپنے خصائص کے لحاظ سے بہت بلند لوگ تھے۔ اس سماج میں ممیاں بہت ہیں، بے شمار بابو گوپی ناتھ ہیں اور لاتعداد موذیلیں ہیں مگر ان کے پاس منٹو کے کرداروں کا دل نہیں ہے۔ ان کے اندر وہ انسان نہیں ہے جسے منٹو دریافت کر لیا کرتا تھا۔

میں ذکر کر رہا تھا ایشر سنگھ کا۔ ایشر سنگھ جو مردہ لڑکی سے مباشرت کے سبب جوہر مردمی کھو بیٹھا تھا۔ یہ موت کی دہشت اور انتہائی غلیظ بدفعلی کے احساس کا نتیجہ تھا۔ اب دیکھیے ایشر سنگھ اور ہمارے موجودہ رویوں میں کیا فرق ہے۔ جب میرے ذہن میں یہ بات آئی اور میں نے معروضی صورت حال کا جائزہ لیا تو میں لرز کر رہ گیا۔ ہماری آج کی اخلاقیات کا منظر نامہ انتہائی خوف ناک ہے۔ ہمارا سماج اخلاقیات کی بدترین سطح پر آ چکا ہے۔ یہ سماج جس سطح پر آ چکا ہے اس کے بعد مزید نیچے گرنے کے لیے کوئی سطح باقی نہیں ہے۔

پچھلے چند مہینوں کے اخباروں میں ہم یہ خبریں پڑھتے ہوئے کانپتے رہے ہیں کہ تازہ دفن شدہ عورتوں کو قبروں سے نکال کر ان کے ساتھ منہ کالے کیے گئے ہیں۔ میں نے ڈی ایچ اے کے ایک نواحی گاؤں کی ایک خاتون کی زبانی بھی اس قسم کی خبر سنی تھی۔ ذرا غور کیجیے اگر آج منٹو زندہ ہوتا تو اس کی ذہنی کیفیت کا کیا حال ہوتا؟ اپنے دور میں وہ اس قسم کے خوف ناک کرداروں کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ موجودہ دور کے یہ کردار اس کے تصور کی آخری حدوں تک بھی موجود نہ تھے۔ کیا ایشر سنگھ ان سے بہتر انسان نہیں تھا ایشر سنگھ کی بدکاری سے اس پہ قیامت گزر گئی تھی مگر اس دور کے کرداروں پر کیا گزری یہ ہمیں کون بتائے گا ہمارے پاس سعادت حسن منٹو موجود نہیں ہے۔

اب میں سن پچاس کی دہائی کے ایک واقعہ کا ذکر کروں گا جس نے منٹو کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ گجرات میں بس سے اترنے والی ایک تنہا عورت کے ساتھ کچھ لوگوں نے گینگ ریپ کیا تھا۔ پورا ملک اس وحشت ناک خبر سے لرز گیا تھا کہ اس وقت یہ حادثات بہت ہی کم تھے۔ منٹو نے خبر پڑھ کر اپنے بھانجے حامد جلال سے کہا کہ مجھے جلد از جلد شراب مہیا کر دو میں حسین بی بی پر کہانی لکھنا چاہتا ہوں۔ حامد جلال نے منٹو کی صحت کے سبب ایسا کرنے سے گریز کیا مگر منٹو کے اصرار پر بوتل مہیا کر دی۔ منٹو نے پی اور کچھ دیر بعد خون کی قے کر دی۔ حسین بی بی پر کہانی نہ لکھی جا سکی اور یوں ہم منٹو کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ''کھول دو'' جیسی ایک کہانی پڑھنے سے محروم رہ گئے۔

ہم ایک ایسے معاشرہ میں زندہ ہیں جو غیر صحت مند ہے۔ ہم ایک ایسی سوسائٹی میں سانس لے رہے ہیں جہاں پر صحت مند شہری اپنے اردگرد اڑنے والی دہشت گردی کے باعث ذہنی طور پر غیر صحت مند ہو رہے ہیں۔ حفاظت اور تحفظ کے اعتبار سے سوسائٹی کسی قسم کی ضمانت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ہر صبح کراچی کے فلیٹ سے اترنے والے آدمی کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ سرشام وہ فلیٹ پر واپس بھی آسکے گا یا نہیں؟

کسی بھی صحت مند معاشرے کے لیے ریشنل اتھارٹی ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

سوسائٹی ریشنل اتھارٹی کو تسلیم کرتی ہے، احترام کرتی ہے، حکم بجا لاتی ہے اور معاشرہ صحت مندی میں سفر کرتا ہے اس کی تخلیقی، تکنیکی اور تہذیبی اقدار ترقی پذیر رہتی ہیں اور سوسائٹی عمدگی سے آگے بڑھتی رہتی ہے۔ اگر یہ اتھارٹی کم زور ہو جائے تو اس کو چیلنج کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اگر ریشنل اتھارٹی کو دہشت گردی کی تباہی کا سامنا ہو تو اس کا استحکام بری طرح مجروح ہو جاتا ہے۔ صحت مند سوسائٹی سراسیمہ سوسائٹی بن جاتی ہے اور اس کی تخلیقی و تکنیکی قوتیں منتشر ہونے لگتی ہیں اور تہذیبی نشوونما رک جاتی ہے۔ مسئلہ اس وقت سنجیدہ ہوتا ہے جب دہشت گرد باقی ماندہ ریشنل اتھارٹی کو ہٹا کر خود اتھارٹی بننا چاہتے ہیں۔ ضیاء الحق اور پرویز مشرف اس نوعیت کی بدترین مثالیں ہیں۔

منٹو معاشرے کی تخلیقی قوت میں یقین رکھتا تھا۔ معاشرے کے لیے وہ تخلیق کا وجود بے حد ضروری سمجھتا تھا۔ ہمارا آج کا دور تقاضا کر رہا ہے کہ معاشرے کو ایک تخلیقی شکل دینے کے لیے آزادی کے حق کی حرمت کو تسلیم کیا جانا چاہیے۔

شخصی آزادی کا حق ہی معاشرے کو ترقی پسند تخلیقی قوت بنا سکتا ہے۔ شخصی آزادی کا زوال یا اس آزادی کو سلب کرنے کا مطلب معاشرتی عمل کی ترقی پسند قوتوں کو مصلوب کر دینے کے مترادف ہے۔ ہماری سوسائٹی کی ترقی پسند قوتوں کو محصور کرنے کی کوشش ۱۹۴۷ء کے بعد سے تسلسل کے ساتھ کی جاتی رہی ہے اور اب زور پر آ گئی ہے۔ ریشنل اتھارٹی کی طرف سے ملنے والی شخصی آزادی حملوں کی زد میں ہے۔ زوال یافتہ طاقتیں ریشنل اتھارٹی کی نفی کرتی ہیں اور شخصی آزادی کی بھی۔ یہی دو عوامل ہیں جو سوسائٹی میں باہمی ربط اور اس کی سیاسی، تہذیبی اور فکری پروموشن کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ریشنل اتھارٹی شخصی آزادی کو تسلیم کرتی ہے اور شخصی آزادی تخلیقی عمل کی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ ان تینوں عوامل سے معاشرے کی ذہنی اور فکری بیداری کا عمل شروع ہوتا ہے۔ پاکستان میں اس وقت یہ تینوں عوامل شدید خطرات کی زد میں ہیں۔

منٹو کے زمانے میں مرد سوسائٹی کا ایک برتر، اعلیٰ اور قوی گروپ سمجھا جاتا تھا۔ ماضی کی تہذیبی روایت نے مرد کو قوت بخشی تھی۔ پاکستان میں آج مرد کے حق میں قبائلی، گروہی، علاقائی اور تہذیبی روایات بھی جمع کر دی گئی ہیں جس نے اسے مزید مضبوط بنا دیا ہے۔ اور آج وہ اس قدر قوی ہو چکا ہے کہ عورت کی حیثیت اس کے سامنے نحیف ونزار کی سی ہو چکی ہے آج کے رویوں میں مرد سوسائٹی مطلق العنان حکم رانوں جیسی ہو چکی ہے اور عورت صیدِ زبوں کی صورت میں ڈھال دی گئی ہے۔ آج کے رویے ازبس غیر انسانی ہو چکے ہیں۔ غیرت کے نام پر عورت کو انتہائی سفاکی سے قتل کر دیا جاتا ہے۔ زندگی میں عورت کو مرد کے انتخاب کا حق مذہب بھی دیتا ہے اور معاشرہ بھی اور عدالت بھی۔ مگر جاگیرداری اور علاقائی معاشرے اس حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ مرد سوسائٹی عورت کو اس کے جائز حق سے محروم کرتی ہے۔ یہ برتر سوسائٹی فیصلہ اپنے پاس رکھتی ہے۔ اگر عورت اس کی حاکمیت کو تسلیم نہ کرے تو مرد سوسائٹی کی غیرت جاگتی ہے اور عورت کو قتل کر دینے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے ان رویوں کی بدترین شکل کاروکاری ہے۔ اگر مرد اور عورت اپنے مستقبل کا فیصلہ مرد سوسائٹی کو نظر انداز کرتے ہوئے کر لیں تو یہ قوی سوسائٹی ان دونوں کو مار دینے کا فیصلہ کر دیتی ہے۔

ہماری سوسائٹی کے رویے عورت کے لیے ازبس ظالمانہ ہو چکے ہیں۔ یہ انسانیت کے معیارات سے گر چکے ہیں۔ مرد کی سائیکی کے رویے سفاکی کی آخری حدوں کو پار کر چکے ہیں۔

منٹو کے عہد تک معاشرہ ان مکروہ مسائل سے دور تھا اس کی کہانیوں میں غیرت اور کاروکاری کی کوئی واردات نہیں ملتی ہے۔ مرد کی سائیکی کی یہ انا پرستی پچھلے ۲۰-۲۵ برسوں میں تیزی کے ساتھ سامنے آئی ہے اور ایک طوفان کی طرح پھیلتی چلی گئی ہے۔

مرد کی سائیکی میں عورت کی تذلیل کے رویے بھی خوف ناک ہوئے ہیں۔ ان میں عورت کو ننگا نچانا اور ننگا کر کے گاؤں کی گلیوں میں پھرانا شامل ہے۔ مختاراں مائی کا خوف ناک واقعہ ہم میں سے ہر شخص کے ذہن میں آج بھی موجود ہے۔

مرد سوسائٹی کی سائیکی کے رویے جنسی نمائش کے کھیل میں عورت کی تذلیل اس حد تک کیوں کرتے ہیں؟ یہ جنسی حظ کا ذریعہ نظر آتے ہیں۔ بہیمانہ جنسی حالتوں میں اس قسم کا حظ مزید بڑھتا ہے اور مزید تسکین کا باعث نظر آتا ہے۔ رویوں کی تنزلی کس حد تک سفر کرے گی، کچھ کہنا مشکل ہے۔

ہمارے رویوں پر قبائلی اور جاگیرداری نظام کے سائے پڑ رہے ہیں۔..... ایک عفریت ہے جو منٹو اور ہمارے عہد کے جمہوری رویوں کو پامال کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس عفریت کا وقت Anti Clock چل رہا ہے۔ اور ہمیں وہ اس کلاک کی حرکت کے مطابق چلانے کے لیے کوشاں ہے۔ یہ کوشش ۱۹۷۷ء کے فوجی حکم رانوں نے شروع کی تھی، اور آج کے دور میں وہ لوگ موجود ہیں جو ان حکم رانوں کی نظریاتی توسیع (Extension) معلوم ہوتے ہیں۔ انسانی تہذیب و تمدن، جمہوریت، ثقافت، علم و فن، سائنس و ٹیکنالوجی کے خلاف مہم چلائی جا رہی ہے۔ جمہوریت کو اسلام دشمن نظام کہنے سے گریز نہیں کیا جاتا یوں ملالہ یوسف زئی ہلاکت کی زد میں لائی جاتی ہے۔ لڑکیوں کے سکول جلا دیئے جاتے ہیں۔ صوفیا کی درگاہیں ثواب کمانے کے لیے مسمار کر دی جاتی ہیں اور برصغیر میں علم اور تصوف کی علامت علی ہجویری کی مسجد میں بم چلا دیے جاتے ہیں۔

یہ سب کچھ کیا ہے؟ ہم کس سمت میں بڑھ رہے ہیں۔ کس منزل کی طرف جا رہے ہیں۔ منزل ہے بھی یا نہیں؟ رائیگانی کا ایک احساس ہے جو وجود کو چیر رہا ہے۔ رائیگانی کے طویل المعیاد منصوبے بنائے جاتے ہیں اور قومی رویے ان کے ہاتھوں برباد ہوتے جا رہے ہیں۔ آج کا پاکستان دہشت گردی کے بدترین رویوں کا سامنا کر رہا ہے۔ دہشت گردی ایک ادارے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ انسانی قتل اس ادارے کا استعارہ بن چکا ہے۔

دہشت گردوں کے لیے انسانی قتل مسرت کی چیز ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قتل خیر کو پیدا کرے گا۔ دہشت گرد وہ شخص ہے کہ جو کم علم ہے اس کی تربیت کرنے والا اس کی کم علمی کو مزید کم کر دیتا ہے۔ ذہن کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اب وہ اپنے انسٹرکٹر کی طرح سوچتا ہے اور انسٹرکٹر ہی کی طرح دنیا کو دیکھتا ہے۔ اس کی ذہنی کایا کلپ اس حد تک کر دی جاتی ہے کہ اس کے وجود، اس کے ذہن، اس کی سوچ کی بالکل نفی کر دی جاتی ہے۔ اب وہ ایک روبوٹ بن جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ لوگوں کا قتل کارِ ثواب، کارِ خیر ہے۔ قتل کے بعد اس پر اس کارِ خیر سے حاصل ہونے والی Ecstasy میں وہ خود کو خدا کے قرب اور جنت کے دروازہ میں کھڑا دیکھتا ہے۔ ذرا سوچیے کہ یہ کتنی بڑی مسرت ہے اور اس مسرت کے حصول کے لیے وہ اپنے ہم وطنوں کو ہم مذہبوں کو، انتہائی سفاکی سے قتل کر دیتا ہے۔

منٹو امن اور انسانیت کا افسانہ نگار تھا۔ انسان سے محبت کرنے والا شخص تھا۔ جمہوریت پر یقین رکھتا تھا اور قائداعظم کا مداح تھا۔ پاکستان آج کل جن قوتوں کا سامنا کر رہا ہے ان کا امن سے کوئی تعلق نہیں، انسانیت پر ان کا یقین نہیں، جمہوریت ان کے لیے غیر اسلامی نظام ہے اور قائداعظم ان کے لیے کوئی آئیڈیل قوت نہیں ایک Irrelevant قوت ہے جس کے ساتھ وہ کسی بھی سطح پر اپنی شناخت نہیں کر سکتے ہیں۔ قائداعظم ان کے لیے ایک متضاد قوت بن چکے ہیں اور ان کے رستے کی بڑی رکاوٹ ہیں۔ ہمیں مقابلہ کرنا ہے ان تباہ کار رویوں کا، انتہائی غیر تخلیقی عناصر کا اور جہالت کی طاقتوں کا، منٹو زندہ ہوتا تو ان عناصر کے خلاف اس کا رویہ بے حد شدید ہوتا۔ میں ایک بار پھر اپنی بات دہراؤں گا ہمارے پاس آج سعادت حسن منٹو موجود نہیں ہے۔ ضرورت ہے اس عہد کے سعادت حسن منٹو کی۔ منٹو کہاں ہے؟